محمد جعفر پھلواروی

تاثرات

پست اور عامیانہ فطرت تو یہی ہے کہ انسان اپنے سر کوئی الزام نہیں لینا چاہتا بلکہ دوسروں کے سر تھوپنا چاہتا ہے خواہ اپنی ہی غلطی کیوں نہ ہو۔ لیکن شریفانہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی غلطی و کوتاہی کو بلا تامل تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس وقت ایک عام شکایت یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان دین سے برگشتہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ شکایت کرنے والے زیادہ تر ہمارے علمائے مذہب ہیں۔ ان کی شکایت غلط نہیں۔ لیکن ہمیں اس کا اصلی سبب تلاش کرنا اور تشخیص سبب کے بعد اس کا مداوا کرنا چاہیے۔ ہر مرض کا صحیح علاج یہی ہے کہ ازالۂ سبب کیا جائے۔

ہم جہاں تک غور کر سکے ہیں نوجوانوں کی برگشتگی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے دل شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ جو شکوک انھیں نفس اسلام کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں اس کے کئی اسباب ہیں۔ مثلاً:

انھیں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر مغرب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ علوم و فنون، سائنٹیفک ایجادات وغیرہ سب کچھ مغرب سے آتا ہے تو ان کے دل پر مغربیت کا تفوق قائم ہونا اور اہل اسلام کی کمتری کا نقش ابھرنا ایک قدرتی بات ہے، اور وہ یہ فرق محسوس کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اسلام اور اہل اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

وہ اہل مغرب کی عملی زندگی اور سیرت و کردار دیکھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں

کی عملی زندگی اور کردار بھی دیکھتے ہیں اور یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام نعوذ باللہ کھوکھلی سی چیز ہے۔

وہ اہلِ مغرب کے ان زہریلے اعتراضات کو بھی سنتے ہیں جو اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف اہلِ مغرب کے قلم سے نکلتے رہتے ہیں اور پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ علمائے مذہب ان کے تسلی بخش جواب کم ہی دیتے ہیں۔

ان تمام وجوہ سے ہمارا نوجوانوں کا طبقہ اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات کی جولاں گاہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی خاطر خواہ مداوا نہیں ہو پاتا۔ اس کا علاج یہ نہیں کہ ان نوجوانوں کو فاسق، کافر، ملحد، بے دین کہہ کر ٹال دیا جائے اور منبروں پر چڑھ کر ان کی ہجو اور مذمت کی جائے اور ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے جائیں۔ نفرت پیدا کر کے ان کی کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے یہیں لاہور کی ایک بہت مشہور مسجد کا ذکر ہے کہ وہاں کے مولانا کے پاس ایک نوجوان بڑی عقیدت سے آیا۔ مجمعے کو چیر کر وہ مولانا سے مصافحہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ مولانا نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے اور گرج کر فرمایا کہ تمھیں شرم نہیں آتی؟ ڈاڑھی منڈا کر مسجد میں ایک عالمِ دین سے مصافحہ کرنے آئے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے۔" کیا یہ طرزِ عمل مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے؟

ایک اور واقعہ سن لیجیے۔ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوریؒ کے پاس ایک نوجوان آیا۔ ڈاڑھی اس کی بھی منڈی ہوئی تھی اور میاں صاحب کو ڈاڑھی منڈوں سے بڑی نفرت تھی۔ انھوں نے مصافحہ تو کیا مگر انھوں نے طنز کرتے ہوئے فرمایا کہ: "تو اس قابل نہیں کہ مجھ سے ملے۔ تیرے چہرے پر ڈاڑھی نہیں۔ تو سنتِ رسول کا تارک ہے" وغیرہ وغیرہ۔ نوجوان نے کہا: حضرت! میں بڑی دور سے دھوپ میں چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ لسی پانی پیو گے یا نہیں؟ کوئی تکان ہو تو آرام کر لو۔ میں پوچھتا ہوں ایک مسافر کے ساتھ

آپ کا یہ دل دکھانے والا برتاؤ سنتِ رسولؐ کے مطابق ہے؟" ــــ اتنا سننا تھا کہ میاں شیر محمد صاحب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اپنی داڑھی پکڑ کر اپنے منہ پر آپ طمانچہ مارنے لگے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے شیر محمد! تجھے رسولؐ کی اخلاق والی سنّت یاد نہ آئی؟ تیرا کیا حشر ہوگا! تجھ سے قیامت میں خلقِ محمدی کے بارے میں سوال ہوگا تو تو کیا جواب دے گا؟

عالمِ مذہب اور صوفی کے مزاجوں کا فرق ان دونوں واقعات سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں کہنا کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ ہمیں خود اپنی حالت پر نظر ڈالنے اور ان نوجوانوں کو اپنے سے دور کرنے کی بجائے اپنے اخلاق کے ذریعے قریب لانے کی کوشش پہلے کرنی چاہیے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہونا چاہیے کہ بڑے ٹھنڈے دل سے ان کے شکوک و شبہات کو سننا چاہیے اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ان کو موثر جواب دینا چاہیے تاکہ ان کے تشویش یافتہ ذہن کو تسکین ہو۔ انھیں دھتکارنے کی بجائے سینے سے لگانا چاہیئے۔ اور ان پر فتواے کفر لگانے کی بجائے ان کو مطمئن کرنا چاہیے۔

سچ پوچھیے تو ان کے بگڑنے کی بڑی ذمے داری خود ہم پر اور ہمارے علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے۔ ہم ان نوجوانوں کی اُن مشکلات پر نظر نہیں رکھتے جو موجودہ علمی و معاشی دور نے پیدا کر رکھی ہیں۔ وہ معاشی ناہمواری دور ہونے کے خواہش مند ہیں لہذا انھیں تقدیر پر قانع رہنے کا وعظ مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ حریتِ ضمیر چاہتے ہیں اس لیے غیر ضروری فقہی جکڑ بندیوں کو قبول نہیں کر سکتے۔ وہ عقلی استدلال سے کچھ باتیں سمجھنا پسند کرتے ہیں۔ لہذا محض خوش اعتقادی سے کسی بات کو تسلیم کرنے کی طرف ان کی فطرت مائل نہیں ہوتی۔ وہ موجودہ دور کے پیدا شدہ مسائل کا حل چاہتے ہیں اس لیے غیر ضروری فرسودہ اور از کار رفتہ مناظروں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کو ان مسائل سے بھی کوئی دلچسپی نہیں جن کا آج کوئی وجود نہیں اور وہ ذہنی تعیش اور لفظی موشگافیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ

دنیا میں بھی کام کے انسان بننا چاہتے ہیں صرف گرفتارِ سجدہ و مصلّٰی بن کر نہیں رہنا چاہتے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسے متحرک دین کے طلب گار ہیں جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کو ہم آہنگ کرے۔ اور اس سے الگ کوئی جامد راہ نہ بتائے۔

اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ اسلام ہی ایک متحرک دین ہے۔ وہ اپنے بنیادی اصول و خطوط میں بے لچک اور بے جنبش میخ آہنی کی طرح گڑا ہوا ہے۔ لیکن عملی تشکیل و جزئیات میں ایسی لچک بھی رکھتا ہے جو ہر پیش آمدہ صورتِ حال کا ساتھ دے سکے۔ اس لحاظ سے وہ تغیر و ثبات دونوں کا مجموعہ ہے لیکن ہمارے ہاں فقہ کے ایک معمولی سے جزئیے کو بھی وہی درجۂ ثبات دے دیا گیا ہے جو کتاب اللہ کے کسی بنیادی حکم کو حاصل ہے۔ اس جمود نے بھی ہمارے نوجوانوں کو برگشتہ کرنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ اسی جمود نے ناقابلِ قبول تعسف اور عملی مشکلات بھی پیدا کر دی ہیں اور عام طور پر ہمارے علما ان کا معقول حل نہیں بتاتے۔ بس فتوائے کفر دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔

سب سے بڑی مصیبت جو ہمارے علماء نے پیدا کی ہے وہ فرقہ بندی ہے۔ ہر فرقے کا عالم دوسرے پورے فرقے کو کافر و مشرک قرار دیتا ہے اور وہ بھی ایسی معمولی باتوں پر جن کو دین میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ یہ تحزب و افتراق دیکھ کر بھی ہمارے نوجوان تشویش میں پڑ جاتے ہیں کہ کسے سچا اور کسے جھوٹا سمجھیں اور نتیجے میں وہ دونوں ہی سے بیزار ہو کر نفسِ اسلام ہی سے برگشتہ ہونے لگتے ہیں۔

نوجوانوں کی برگشتگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ عام طور پر علما سے جو مسائل سنتے رہتے ہیں وہ طہارت، نماز روزہ، یا نکاح و طلاق کے مسائل ہوتے ہیں۔ اسے دیکھ کر سارے نوجوان یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اسلام بس انہی چند چیزوں کا نام ہے یا کم از کم علمائے کرام کے پاس صرف یہی مسئلے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نوجوانوں میں کوئی پائلٹ بننا چاہتا ہے، کوئی اکاؤنٹنٹ، کوئی انجینئر، اور کوئی ڈاکٹر۔ کوئی ایڈیٹر اور کوئی پروفیسر، کوئی سائنسدان

اور کوئی آرٹسٹ۔ لیکن وہاں ان کو ان چیزوں کا کوئی ذکر نہیں سنائی دیتا۔ اس لیے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نعوذ باللہ اسلام کو نہ دنیاوی ترقیات سے کوئی واسطہ ہے اور نہ اس میں ہمارے درد کا مداوا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہمارے علمائے کرام ان نوجوانوں کو ملحد و بے دین قرار دے کر اپنے سے جدا نہ کریں بلکہ ان سے بڑی فراخ دلی اور خوش خلقی کے ساتھ پیش آئیں۔ ان کے شبہات کو بڑے ٹھنڈے دل سے سنیں اور غور کر کے خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا جواب دیں۔ ایسا جواب جو انھیں مطمئن کر دے۔ انھیں فاسق و گمراہ قرار دے کہ اپنے سے جدا نہ کریں۔ انھیں دین کی باتیں اس طرح سمجھائیں کہ انھیں یہ آسان اور قابلِ عمل معلوم ہو اور آہستہ آہستہ وہ خود اپنی خوش دلی کے ساتھ اصولی پھر فروعی احکام کو قبول کرتے جائیں، اور ردہ اس کا کوئی بوجھ اپنے اوپر نہ محسوس کریں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے ذوق اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہی انھیں وہ باتیں سمجھائی جائیں جن کی وجہ سے وہ شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دینی احکام کی تعبیریں ایسے نئے انداز سے کی جائیں جن کو ان کا ذہن آسانی سے قبول کر لے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے علماءِ کرام جلد سے جلد اپنی کوتاہیوں کو محسوس کر کے ان کو دور کریں اور نوجوانوں کی برگشتگی کے اسباب کا تدارک فرمائیں۔